پروفیسر محمد منور

میثاقِ لکھنؤ

مسلمانانِ برعظیم پاک و ہند کے سیاسی سفر کا نہایت اہم سنگِ میل

لکھنؤ پیکٹ (میثاق لکھنؤ) ۱۹۱۶ میں بمقام لکھنؤ مسلم لیگ اور کانگرس کے مابین طے پایا تھا۔ کانگرس ۱۸۸۵ میں تشکیل پذیر ہوئی تھی۔ مسلم لیگ ۱۹۰۶ میں صورت پذیر ہوئی۔ مسلم لیگ اور کانگرس اکتالیس سال متوازی چلیں۔ ان دو بڑی سیاسی جماعتوں کے مابین میثاقِ لکھنؤ کے سوا کبھی کوئی معاملہ بخیر و خوبی طے نہ پایا[۱] جب بھی سیاسی ارتقا کے تقاضے کسی تغیرِ حال کے طالب ہوئے تو مسلم لیگ کا موقف اور ہوا اور کانگرس کا اور، مگر یہ بالکل طبعی امر تھا۔ اس کے برعکس ہوتا تو حیرت ہوتی۔

بات سیدھی سی ہے کہ اسلام اور کفر ایک شے نہیں۔ اسلام کو ماننے والی تمام اقوام ایک ملّت (امت) ہیں اور اسلام سے عداوت رکھنے والی قومیں ایک ملّت ہیں اور بُعدِ میانہ بہت ہے۔ یہ بُعد مکانی نہیں روحانی ہے۔ سر عبدالرحیم کے بقول ہم مسلمان افغانستان، ترکستان وغیرہ کسی ملک میں مسلمانوں کے یہاں اُتریں، بڑی جلدی گھل مل جاتے ہیں، اس لیے کہ آداب وہی، اخلاق وہی، نقطۂ نظر وہی، ہمہ نوعی ساز و سامان وہی اور بالعموم اسماء بھی وہی ہوتے ہیں۔ مگر خود اپنے یہاں اپنے شہر کے مسلم محلے اور ہندو محلے کے مابین فقط ایک گلی یا سڑک حائل ہوتی ہے، جوں ہی وہ سڑک یا گلی عبور کرتے ہیں ہمیں ایک نئی اور اجنبی دنیا نظر آنے لگتی ہے۔ جہاں نام جدا ہیں، اسبابِ خانہ داری جُدا ہیں۔ طریقِ سلام و آداب جُدا ہیں۔ زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر جُدا ہے[۲]۔ یعنی اسلام کے رشتے سے بُعدِ مکانی میں قربِ روحانی جلوہ گر اور اس کے برعکس قربِ مکانی میں بُعدِ روحانی کا منظر۔

۱۔ انڈیا اے ری سٹیٹمنٹ، ص ۱۴۱۔ پروفیسر کوپ لینڈ، ۱۹۴۵

۲۔ دی مِیننگ آف پاکستان، ص ۷۲ — ایف، کے درانی ۱۹۴۶

ابونواس نے ٹھیک ہی تو کہا تھا :

آریٰ انّ قرب الدّار لیس بنافع

اذا کان ما بین القلوب بعید!!

(میں نے دیکھا ہے کہ اگر دلوں کے مابین طویل فاصلے حائل ہوں تو ہمسائگی کوئی فائدہ نہیں دیتی)۔

میثاق لکھنؤ کس طرح عمل میں آیا، یہ بھی دلچسپ معاملہ ہے۔ آپ کو یاد ہے کہ لارڈ کرزن نے صوبہ بنگال کو اس کی کثرتِ آبادی کے پیشِ نظر اور نظم و نسق کو بہتر بنانے کی خاطر دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا[۵۳]۔ یہ مسلمانوں کا مطالبہ نہ تھا۔ ایک صوبہ مشرقی بنگال کے نام سے موسوم ہوا جس کے ساتھ آسام بھی نتھی تھا۔ دوسرا صوبہ مغربی بنگال بنا۔ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، یعنی مسلمان اس صوبے میں تھوڑی بہت انتظامی سہولت کے باعث کسی قدر زرعی، تجارتی اور تعلیمی منفعت حاصل کر سکتے تھے۔ بس پھر کیا تھا، ہندوؤں نے آسمان سر پہ اٹھالیا کہ یہ سکیم محض بنگالی قوم کو، جو سیاسی شعور کی مالک ہے، دو حصوں میں تقسیم کر کے کمزور و ناتواں بنا دینے کی نیت سے نافذ کی گئی ہے۔ کانگرس کی قیادت نے شورش کے اس فتنے کو جنگل کی آگ کی مانند پھیلایا۔ لوکمانیہ تلک جیسے سیوا سبھائی لوگ آگے آگئے، بندے ماترم جلسوں اور جلوسوں میں گایا جانے لگا[۵۴]۔ مسلمان حیران تھے۔ گو وہ جانتے تھے کہ ہندو ہندو ہے اور مسلمان مسلمان۔ ہندو کی اس واضح تنگ نظری نے انہیں بڑا دکھ پہنچایا[۵۵]، مگر مسلمان اس وقت منظم نہ تھے۔ ان کی کوئی سیاسی جماعت نہ تھی۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس یا اس طرح کی دو ایک اور تنظیمیں تھیں، مگر ان سے وہ سیاسی کام نہیں لیا جا سکتا تھا جو کام ہندو قوم کانگرس سے لے رہی تھی۔

ہندوؤں کے اس واضح معاندانہ رویے کے باعث مسلم لیگ کی تشکیل کے عمل کو تعجیل میسر آگئی ورنہ جب سے ہندوؤں نے اردو ہندی جھگڑا شروع کیا تھا اور بلدیاتی اداروں میں مسلمانوں کو منتخب

---

۵۳ دی مسلمز آف برٹش انڈیا، ص ۱۴۸۔ پی ہارڈی، ۱۹۷۲ء

۵۴ ایضاً، ص ۱۵۰

۵۵ فاؤنڈیشنز آف پاکستان، ص ۳۴

اور نامزد ہونے سے محروم رکھا تھا، مسلمان اپنی علیحدہ سیاسی جماعت بنانے کے باب میں سوچتے آرہے تھے، اس ضمن میں نواب سلیم اللہ خان، نواب وقار الملک، نواب عماد الملک، نواب محسن الملک اور دیگر اکابر آگے آگئے تھے، مگر یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں۔

بہرحال تقسیم بنگال نے مسلمانوں کو ایک اپنی علیحدہ سیاسی تنظیم قائم کرنے کے باب میں تازیانے کا کام دیا۔ اور دسمبر ١٩٠٦ء میں مسلم لیگ وجود میں آگئی جس کے بنیادی مطالبات یہ تھے کہ مختلف سطح کے نیم جمہوری اداروں، صوبائی اور مرکزی لیجسلیٹو کونسلوں میں مسلمان کی حیثیت سے جداگانہ انتخابات اور نامزدگیاں عمل میں آئیں[٥٦]۔ ١٩٠٩ء میں منٹو مارلے سکیم نے جنم لیا[٥٧] اور اس طرح مسلمانوں کو جداگانہ حقِ انتخاب مل گیا۔ یہاں سے گویا جواہر لال نہرو کے بقول فرقہ وارانہ دو مختلف لہریں ہندو اور مسلم کے نام سے چل پڑیں جو پنڈت جی کے خیال میں آگے جا کے تقسیم برِّصغیر کے شاخسانے کا سبب بنیں[٥٨]۔ حالانکہ معاملہ برعکس تھا۔ ہندو ہندو تھے اور مسلمان مسلمان، اور یہ امر خود ہندوؤں نے عملاً بارہا ثابت کیا جس کا نتیجہ مسلمانوں کی طرف سے جداگانہ حقِ نیابت و انتخاب کا مطالبہ تھا۔ مگر ہندو خواہ وہ پنڈت جواہر لال نہرو ہی کیوں نہ ہو، اسے مجرم فقط مسلمان ہی دکھائی دیتا ہے، اور مسلمان کا مقصود واضح ہے کہ وہ مسلمان ہے اور مصر ہے کہ وہ ہندو نہیں کہلائے گا۔

ادھر تو انگریز نے ایک حقیقت اور صداقت کو تسلیم کر لیا کہ مسلمان ہندوؤں سے بالکل الگ قوم ہیں لہٰذا جداگانہ حقوق کا مطالبہ کرنے کے معاملے میں حق بجانب ہیں مگر دوسری طرف ہندو کی شورش سے متاثر ہو کر تقسیم بنگال منسوخ کر دی۔ اس سے مسلمانوں کو من حیث القوم بڑا سخت دھچکا لگا۔ انھیں احساس ہو گیا کہ سیاست میں ایجی ٹیشن ایک مفید عنصر ثابت ہو سکتی ہے۔ اب گویا کھلے بندوں مسلمان ہندوؤں سے دُور کھنچنے لگے اور ہندو محسوس کرنے لگے کہ اگر مسلمان من حیث القوم ان کے مخالف رہے تو ان کی کوئی جدّوجہد، قومی جدّوجہد قرار نہ پائے گی۔ مسٹر گوکھلے اور دادابھائی ناروجی وغیرہ اسس

---

٥٦ دی سٹرگل فار پاکستان، ص ٣٠، کیو، ایچ قریشی۔ ١٩٦٥ ٥٧ ایضاً، ص ٣٤

٥٨ فاؤنڈیشنز آف پاکستان، ص ٧، ٤١، شریف الدین پیرزادہ۔ پروفیسر بلراج مدھوک نے بھی تقسیم ہند کا آغاز ١٩٠٩ء کی اصلاحات قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو: ہندوستان اون دی کراس روڈز۔ ص ٣٣

صورتِ حال کی سنگینی کو سمجھتے تھے۔ قائداعظم ان دنوں کانگرس میں تھے اور وہ بدل و جاں اس امر کے خواہاں تھے کہ ہندو مسلم کشیدگی میں کمی ہو اور وطن کی بہتری کے لیے دونوں قومیں مل کر جد و جہد کریں قائداعظم پر مسلمانوں کو بھی اعتماد تھا، وہ بھی ان کے خلوص پر یقین رکھتے تھے۔ نیز یہ بھی جانتے تھے کہ وہ مسلمانوں کے ملّی مسائل کے ساتھ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ چنانچہ انھیں مسلم لیگ کے اجلاسوں میں شرکت کرنے کی بطور خاص دعوت دی جاتی رہی، اور وہ ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۱ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاسوں میں باضابطہ شریک ہوئے[۹]۔ حالانکہ اس وقت وہ مسلم لیگ کے رکن نہ تھے۔ انھوں نے اجلاسوں کو خطاب بھی کیا اور مشورے بھی دیے۔

۱۹۱۳ میں قائداعظم کے ایما و اصرار پر مسلم لیگ کے سیاسی منشور میں تبدیلی کی گئی اور اس کا مطمح نظر بھی حکومت خود اختیاری قرار پایا۔ وہ حکومت خود اختیاری جو ہندوستان کے لیے موزوں ہو[۱۰]۔ اسی دوران میں قائداعظم کانگرس کے مسائل کو پارلیمنٹ میں پیش کرنے کی خاطر ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے لندن گئے۔ مولانا محمد علی جوہر بھی لندن پہنچے۔ وہ کانگرس کے علاوہ مسلم لیگ کے بھی رکن تھے۔ انھوں نے لندن ہی میں قائداعظم کو مسلم لیگ کا رکن بنا لیا[۱۱]۔ اس زمانے میں یہ اجازت تھی کہ مسلمان کانگرس اور مسلم لیگ کے بیک وقت رکن ہو سکتے تھے، اب حال یہ تھا کہ مسلم لیگ کو بھی قائداعظم پر بھرپور اعتماد تھا اور کانگرس کو بھی۔ کانگرس کے مقبول ترین قائدین مثلاً ناروجی اور گوکھلے ان سے محبت کرتے تھے اور ان سے ہندوستان کے روشن مستقبل کے باب میں نیک توقعات وابستہ کیے ہوئے تھے۔ گوکھلے تو انھیں مستقبل کے ہندو مسلم اتحاد کا سفیر قرار دیتے تھے[۱۲] اور قائداعظم بھی کہتے تھے کہ وہ مسلم گوکھلے بنیں گے[۱۳]۔

چنانچہ قائداعظم نے کانگرس اور مسلم لیگ کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اور یہ کام فقط قائداعظم ہی کر سکتے تھے اس لیے کہ دونوں جماعتوں کا ایسا معتمد دوسرا کوئی

۹؎ محمد علی جناح، ص ۱۶۔ ایم، ایچ سید، ۱۹۶۲ ۔ ۱۰؎ ایضاً ۔ ۱۱؎ ایضاً ص ۳۹

۱۲؎ محمد علی جناح، ایمبسڈر آف یونٹی، ص ۱۔ مسز سروجنی نائیڈو۔

۱۳؎ مطلوب الحسن سید، ص ۱۹

نہ تھا، یہ گویا سفر تھا لکھنؤ پیکٹ کی منزل کی طرف، اب قائداعظم نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ مسلم لیگ کو خصوصی دعوت دی کہ وہ اپنا سالانہ اجلاس (۱۹۱۳ء) کانگرس کے شانہ بشانہ بمبئی میں منعقد کرے، مگر مسلمانوں کے ایک گروہ کو جو ہندوؤں سے بہت نالاں تھا، خوف لاحق ہوا کہ کہیں قائداعظم مسلم لیگ کو کانگرس میں مدغم نہ کر دیں - نیز یہ احتمال بھی تھا کہ حکومت ان دونوں کی یک جائی اور یک جہتی کو پسند نہ کرتی تھی، لہٰذا ہندو مسلم اتحاد آخر حکومت کیوں پسند کرتی - نتیجہ یہ کہ مسلم لیگ کے اجلاس میں بدمزگی پیدا ہوئی اور جلسۂ عام برخاست ہو گیا - دوسرا اجلاس تاج محل ہوٹل میں منعقد ہوا اور کارروائی مکمل کی گئی ۔[۱۴]

اس عرصے میں مسلمانوں کو چند پریشان کن احوال کا سامنا کرنا پڑا - ایک طرف ترکوں کو طرابلس میں ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑا اور دوسری طرف بلقان میں - جسے مسلمانوں نے بری طرح محسوس کیا - مراکش کو سپین اور فرانس نے دبوچ لیا - انگریزوں کی ہمدردیاں ترکوں کے دشمنوں سے تھیں، اس سے انگریز کے خلاف مسلمانوں کے دلوں میں نفرت جاگزیں ہونے لگی - عین اسی زمانے میں مسجد کان پور کا حادثہ رونما ہوا، جس نے جلتی پر تیل کا کام دیا - مولانا محمد علی نے جب قائداعظم کو لندن میں مسلم لیگ کا رکن بنایا تو وہ اس وقت مسجد کان پور ہی کے باب میں فریاد کرنے اور شکایت پہنچانے گئے تھے - پھر ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم اوّل چھڑ گئی - اس جنگ میں ترک ایک طرف تھے اور انگریز دوسری طرف - سلطان ترکی کو مسلمانوں کے یہاں خلیفۃ المسلمین کی حیثیت حاصل تھی، گویا برِ اعظم کے مسلمانوں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی، اور پی ہارڈی کے بقول دوسری طرف کانگرس کا منشا یہ تھا کہ آئینی اور سیاسی تبدیلی کی رفتار تیز تر ہو[۱۵] اس طرح مسلمانوں کو تقسیم بنگال کی تلخی یاد نہ رہی اور وہ ہندوؤں کے ساتھ ایکا کرنے پہ آمادہ ہو گئے، ہندو بھی چاہتے تھے کہ انھیں مسلمانوں کی مدد میسّر رہے - اس صورتِ حال کا فائدہ سفیر اتحاد نے خوب خوب اٹھایا - انھوں نے ہندوؤں سے کہا کہ آپ لوگ اگر مسلمانوں کی دلجوئی کی خاطر اور ان کے توہمات دور کرنے کی نیت سے جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیں تو کیا حرج

---

[۱۴] مطلوب الحسن سید، ص ۱۴۱

[۱۵] دی مسلمز آف برٹش انڈیا، ص ۱۸۷ - پی ہارڈی ۱۹۷۲ء

ہے [۱۵۵]، اس طرح مسلمان ہندو اکثریت کے حسنِ نیت پر اعتماد کرنے لگیں گے اور بے خوف ہوکر تعاون کی راہ اختیار کریں گے۔

قائد اعظم کی ان دلیلوں نے جو مبنی بر خلوص تھیں ہندو قائدین کو بڑی حد تک قائل کرلیا، لہذا انھوں نے ایک کمیٹی مسلمانوں کی تشکیل دی اور ایک ہندوؤں کی۔ مسلمانوں کی کمیٹی کے ارکان کا تعلق مسلم لیگ سے تھا اور ہندوؤں کی کمیٹی کا تعلق کانگرس سے تھا۔ ان دونوں کمیٹیوں نے ۱۹۱۵ء میں کچھ تجاویز مرتب کیں، ان تجاویز پر قائد اعظم نے امپریل لیجسلیٹو کونسل کے انیس ہندو مسلم ارکان سے دستخط کرائے تاکہ ان ہندو مسلم متحدہ تجاویز کو یادداشت کی صورت میں وائسرائے کے حضور پیش کر کر دیا جائے [۱۵۶]۔ تاریخ میں اس یادداشت کو MEMORANDOM OF THE NINETEEN کہہ کے یاد کیا جاتا ہے۔ ۱۹۱۵ء میں بھی مسلم لیگ اور کانگرس کے اجلاس ایک ہی مقام پر منعقد ہوئے تھے۔ اکتوبر ۱۹۱۶ء میں قائد اعظم نے مسلم لیگ اور کانگرس کے قائدین کا ایک اجلاس الہ آباد میں بلایا، جنھوں نے اُن متفقہ تجاویز کی تائید کی۔ اب گویا مسلم لیگ کے کھلے اجلاسوں میں ان تجاویز کو پیش کرنے کے لیے ضروری تیاریاں عمل میں آچکی تھیں، چنانچہ دسمبر ۱۹۱۶ء میں بمقام لکھنو مسلم لیگ اور کانگرس کے سالانہ اجتماع منعقد ہوئے۔ اور دونوں نے ان تجاویز کی منظوری دے دی، گویا ان تجاویز کے باعث وہ سکیم بنی جسے مستقبل کے لیے اصلاحات کی سکیم بننا تھا۔ اس سکیم کا ملخص ذیل میں بالفاظ سید حسن ریاض درج کیا جاتا ہے:

"اس سکیم میں مسلمانوں کے خاص حقوق اور مفاد کے لیے یہ تھا کہ صوبائی کونسلوں میں جداگانہ انتخاب کے ذریعے مندرجہ ذیل تناسب کے مطابق مسلمانوں کی نمائندگی ہوگی — پنجاب میں ہندوستانی منتخب ارکان کونسل کی نصف تعداد مسلمان ہو، یوپی میں ۳۰ فی صد، بنگال میں ۴۰ فی صد، بہار میں ۲۵ فی صد، سی پی میں ۱۵ فی صد، مدراس میں ۱۵ فی صد اور بمبئی میں منتخب ہندوستانی ممبروں کی ایک تہائی تعداد — یہ اس شرط پر کہ مسلمان صوبائی مجالس واضعانِ قانون اور امپریل لیجسلیٹو کونسل کے انتخابات میں سوائے اپنے خاص حلقوں کے دوسرے حلقوں سے کھڑے نہ ہوں۔

---

[۱۵۵] قائد اعظم جناح: ص ۸۰ — جی الانا

[۱۵۶] مطلوب الحسن سید، ص ۲۷

دوسری شرط یہ تھی کہ کسی ایسے مسودۂ قانون یا اس کی کسی دفعہ اور یا کسی ایسے ریزولیوشن پر جو کسی غیر سرکاری ممبر نے پیش کیا ہو اور جس سے ایک یا دوسرا فرقہ متاثر ہوتا ہو کسی مجلس واضعانِ قانون یا امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں کوئی کارروائی نہ کی جائے گی، اگر فرقہ متاثرہ کی تین چوتھائی تعداد اس مسودۂ قانون یا اس کی دفعہ یا ریزولیوشن کی مخالفت کرے، یہ فیصلہ کرنا کہ وہ مسودۂ قانون یا اس کی کوئی دفعہ یا ریزولیوشن اس فرقے پر ضرر کے ساتھ اثر انداز ہے اسی فرقے کے ان لوگوں کا کام ہے جو اس مجلس واضعانِ قانون کے رکن ہوں۔

امپیریل کونسل کے متعلق یہ تھا کہ اس میں منتخب ہندوستانی ممبروں کی کل تعداد کا ایک ثلث مسلمان ہوں گے اور وہ مختلف صوبوں سے اسی تناسب کے مطابق جو ان کا صوبائی کونسلوں میں ہو جداگانہ مسلم انتخابی حلقوں سے منتخب ہوں۔

جو چیز مشترکہ (حسن ریاض کا مطلب شاید متحدہ ہے) ہندوستان کی تاریخ میں لکھنؤ پیکٹ کے نام سے مشہور ہے، وہ یہی مشترکہ اسکیم تھی۔ بے شک لکھنؤ پیکٹ مسٹر جناح کی معاملہ فہمی، الجھے ہوئے معاملات کو سلجھانے کی صلاحیت اور بدگمان فریقوں کے درمیان افہام و تفہیم کی قابلیت کا ایسا شاہکار ہے کہ بس ایک ہی دفعہ ظہور میں آسکا۔[۱۸]"

لکھنؤ پیکٹ کے خلاف بعض مسلمان قائدین نے شدت سے اظہار رائے کیا، ان کا کہنا تھا کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے وہاں اگر انھیں چند نشستیں زیادہ بھی مل جائیں تو اکثریت کے اقتدار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس کے برعکس بنگال اور پنجاب میں مسلم اکثریت کو غیر مؤثر بنا کر رکھ دیا گیا ہے[۱۹]۔ ان مخالفین میں سب سے زیادہ نمایاں میاں سر شفیع تھے۔ مسلم لیگ کی قیادت سے میاں شفیع کے اختلافات اس قدر بڑھے کہ آخر ان کی پنجاب مسلم لیگ کو مرکزی لیگ سے منقطع کر کے میاں سر فضل حسین کو سربراہ بنا دیا گیا، میاں سر شفیع کے علاوہ نواب علی چوہدری نے بھی لکھنؤ پیکٹ کی مخالفت کی، چوہدری صاحب نواب سلیم اللہ خان کے ان ساتھیوں میں سے تھے جنھوں نے شملہ وفد ۱۹۰۶ء میں شرکت

۱۸؎ پاکستان ناگزیر تھا، ص ۱۷۰، ۱۷۱، سید حسن ریاض

۱۹؎ ایمرجنس آف پاکستان، ص ۱۵۔ چوہدری محمد علی

کی تھی، وہ کہتے تھے بنگال کی مسلم اکثریت کو کل ۴۰ فی صد نشستیں دے کر اقلیت میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ سر عبدالرحیم نے بھی مخالفت کی، ان کی پیشِ نظر بھی بنگال کے مسلمانوں کی حق تلفی تھی۔ نواب علی چوہدری اور سر عبدالرحیم نے پیکٹ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔[۲۰] بنگال کے دیگر راہنماؤں نے جن میں اے کے فضل الحق بھی شامل تھے، پیکٹ کی حمایت کی۔ اے کے فضل الحق نے کہا کہ جو کچھ مسلمانوں کو اب مل گیا ہے، اس کا مقابلہ اس سے کرنا چاہیے جو پہلے حاصل تھا۔ پہلے منٹو مارلے سکیم کے تحت جو شرائط انتخاب تھیں ان کی رو سے بنگال کی مجلس واضعانِ قانون میں مسلمانوں کی نشستیں کل ¼ ۱۰ فی صد (سوا دس) تھیں۔ اب ۴۰ فی صد ہیں۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ ترقی کا قدم آگے کتنا بڑھا۔[۲۱] یہی عالم پنجاب کا تھا جہاں منٹو مارلے سکیم کے تحت مخلوط انتخابات اور مسلمانوں کی نشستوں کا تعین کوئی نہ تھا۔[۲۲] چوہدری خلیق الزمان نے تو اس پیکٹ کو مسلمانوں کی ناتجربہ کاری اور نااہلی کا مظہر قرار دیا ہے، وہ بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریتی حیثیت کے مجروح ہونے کا واویلا تو ٹھیک کرتے ہیں مگر عجیب امر یہ ہے کہ کہتے ہیں اس پیکٹ کے باعث ہندو مسلم روابط میں فرقہ وارانہ زہر در آیا جو آگے چل کر برصغیر کی تقسیم کا باعث بنا۔[۲۳] سوال یہ ہے کہ ہندو مسلم ایک قوم کب تھے۔ مسلمان ہندوؤں کے لیے کب ملیچھ نہ تھے اور مسلمانوں نے ہندوؤں کو کب اپنا سمجھا تھا، دونوں میں کش مکش کب نہ تھی؟ ہاں لکھنؤ پیکٹ کے باعث ہندو مسلم اتحاد کی ایک ظاہری صورت ضرور جلوہ گر ہوئی اور برصغیر میں آئینی اور سیاسی اصلاحات کی ترقی کا قدم یقیناً آگے بڑھا۔ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات پر لکھنؤ پیکٹ اثر انداز رہا۔ حتیٰ کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے تینوں ادوار کی فضا بھی اس اثر سے آزاد نہ ہو سکی اور کمیونل اوارڈ اسی پیکٹ کی روشنی میں نافذ ہوا۔ بنگال اور پنجاب میں یقیناً مسلم اکثریت کی اکثریتی حیثیت کو زک پہنچی، مگر نشستوں کی تعیین کے بغیر اس پیکٹ سے قبل وہاں مسلمانوں کو جو کچھ مل رہا تھا، اس کے مقابل بنگال میں بھی اور پنجاب میں بھی تقریباً تیس تیس

---

۲۰ ماڈرن مسلم انڈیا اینڈ دی برتھ آف پاکستان ص ۲۷۵۔ ایس۔ ایم اکرام ۲۱ ایضاً، ص ۲۷۹

۲۲ سید حسن ریاض، ص ۴۳

۲۳ پاتھ وے ٹو پاکستان، ص ۳۷۔

فی صد کا فائدہ ہوا[۳۶]۔ اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کو کہیں ڈیوڑھی نشستیں ملیں اور کہیں دُگنی ۔ مرکز میں ۲۵ فی صد کی جگہ منتخب ارکان کی ۳۳ فی صد نشستیں مسلمانوں کو حاصل ہوگئیں اور وہ ایک قوت بن گئے ، وہ قوت جو کانگرس کو بھی محسوس ہوتی تھی اور انگریزی حکومت کو بھی ، مگر ان سب سے بڑا فائدہ جو مسلمانوں کو حاصل ہوا وہ یہ تھا کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کے جداگانہ حقوق کو تسلیم کر لیا جس کا سیدھا اور صاف مطلب یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں اور قائداعظم نے یہ وہ بات کانگرس سے منوالی کہ آگے چل کر کانگرس کے گلے کا طوق بن گئی اور کانگرس دو قومی نظریے کی حقیقت سے پھر کبھی جان نہ چھڑا سکی ۔ منٹو مارلے سکیم ہی سے آئینی اور سیاسی اصلاحات کے میدان میں دو قومی عمل شروع ہو گیا تھا مگر وہ انگریزی کی طرف سے مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی کا اعتراف تھا ، ہندوؤں کی طرف سے نہ تھا ۔ اب لکھنؤ پیکٹ نے کانگرس کی طرف سے دو قومی نظریے کو منوالیا ۔ دوسری بڑی بات یہ تھی کہ کانگرس نے مسلم لیگ کے ساتھ یہ پیکٹ کر کے گویا عملاً یہ بھی تسلیم کر لیا کہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ ہے اور کانگرس صرف ہندوؤں کی نمائندہ ہے ۔ لکھنؤ پیکٹ اس باب میں بھی کانگرس کے گلے کا طوق ثابت ہوا کہ آگے چل کے جب مسلمانوں نے اپنی جداگانہ جدوجہد آزادی شروع کی اور جواباً کانگرس نے بہ شد و مد نیشنل روپ دھارنا چاہا اور اپنے آپ کو ہندو مسلم دونوں قوموں کا نمائندہ ثابت کرنا چاہا تو لکھنؤ پیکٹ کی رُو سے مسلمانوں کے باب میں عملاً تسلیم کردہ مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت کی تردید مشکل ہو گئی ۔ مثلاً ملاحظہ فرمائیے قائداعظم کا ایک مکتوب بنام سوبھاش چندر بوس ۔ یہ خط اگست ۱۹۳۸ء کا مورخہ ہے ، اس میں پنڈت جواہر لال نہرو کے اس بیان کی طرف اشارہ ہے جس میں انھوں نے بصد غرور ارشاد فرمایا تھا کہ ہندوستان میں فقط دو پارٹیاں ہیں ، ایک برٹش حکومت اور دوسری کانگرس ۔ بہر حال قائداعظم کے الفاظ یہ ہیں :

”کونسل (مسلم لیگ) اس امر پر یقین کامل رکھتی ہے کہ مسلمانانِ ہند کی مستند اور نمائندہ جماعت فقط مسلم لیگ ہے ۔ جب ۱۹۱۶ء میں بمقام لکھنؤ کانگرس مسلم لیگ پیکٹ عمل میں آیا اس پوزیشن کو تسلیم کر لیا گیا تھا ۔ ازاں بعد ہمیشہ اسے بلا چون و چرا تسلیم کر لیا جاتا رہا ، حتیٰ کہ جب ۱۹۲۵ء میں جناب راجندر پرشاد

۳۶؎ دی مسلمز آف برٹش انڈیا ، ص ۱۸۸ ۔

گفت و شنید ہوئی تو جب بھی اس مسلّم حقیقت سے تعرض نہ کیا گیا۔ اس لیے (اب) آل انڈیا مسلم لیگ کو کوئی ضرورت نہیں اس بات کی کہ کانگرس اس کو مانتی اور تسلیم کرتی ہے یا نہیں اور نہ بمبئی میں (مسلم لیگ کی) ایگزیکٹو کونسل کی قرارداد کا یہ منشا تھا۔ مگر اس امر کے پیشِ نظر کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے ایک بیان کی رُو سے مسلم لیگ کی پوزیشن ہی کو ماننے سے انکار نہیں کر دیا بلکہ سرے سے اس کے وجود ہی کی نفی کر دی اور جب یہ بیان دیا تو وہ کانگرس کے صدر تھے۔ اس بیان میں پنڈت نہرو نے اس امر پر زور دیا کہ ملک میں فقط دو پارٹیاں ہیں، ایک برٹش گورنمنٹ اور دوسری کانگرس۔ تو ایگزیکٹو کونسل (مسلم لیگ) نے لازم جانا کہ کانگرس کو اس بنیادی شرط سے آگاہ کر دیا جائے جس کی روشنی میں ان دو تنظیموں کے مابین بات چیت ہو سکتی ہے[۲۵]۔"

پروفیسر کوپ لینڈ لکھتے ہیں کہ یہ پیکٹ (لکھنؤ پیکٹ) مسلمانوں کے حضور (کانگرس کی طرف سے) ہتھیار ڈال دینے کے مترادف تھا۔ آخر کار ہندوؤں نے جداگانہ انتخاب کا اصول مان لیا[۲۶]۔

حق یہ ہے کہ کانگرس پر ۱۹۱۶ء تک کچھ نہ کچھ اثر سر فیروز شاہ مہتہ، دادا بھائی نارو جی اور گوکھلے وغیرہ کی شخصیتوں کا باقی تھا اور ہر تعصب کے باوصف مسلمانوں کو ساتھ ملائے رکھنے کا ایک جذبہ کارفرما تھا، اسی مقصد کی خاطر کانگرس نے مسلمانوں کے ساتھ مفاہمت کر لی تھی، مسلمان چاہتے تھے کہ یہ مفاہمت جاری رہے اور آئندہ بھی جملہ معاملات افہام و تفہیم ہی سے طے ہوں۔ پروفیسر کوپ لینڈ مُون لکھتے ہیں کہ قائد اعظم تو ۳۴، ۱۹۳۵ میں بھی لکھنؤ پیکٹ کے دَور کی فضا کا اِحیا چاہتے تھے[۲۷] جس کا مطلب یہ تھا کہ انگریزوں کے یہاں سے ثالثی فیصلے لینے کے بجائے ہندو مسلمان آپس میں اپنے مسائل طے کر لیں مگر جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے لکھنؤ پیکٹ واحد معاہدہ ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی نمائندہ دو تنظیموں کے مابین بخیر و خوبی طے پایا۔

لکھنؤ پیکٹ مسٹر گاندھی کو ناگوار گزرا تھا مگر وہ اس وقت اس کی راہ روک سکنے کی حیثیت میں نہ تھے۔ وہ جنوری ۱۹۱۵ء میں افریقہ سے لوٹے تھے۔ وہ بیس بائیس برس سے افریقہ میں

---

۲۵ یونٹی ٹاکس۔ دو، لاب سنگھ، ۱۹۴۶ء (سوبھاش چندر بوس اور قائد اعظم کی خط و کتابت)، ص ۱۳

۲۶ انڈیا اے ری سٹیٹمنٹ، ص ۱۰۹، پروفیسر کوپ لینڈ ۲۷ ایضاً، ص ۱۵۰۔

مقیم تھے۔ جب وہ برِّعظیم میں آئے تو کانگرس میں مقامِ امتیاز پانے کی خاطر قدرے جدّوجہد کی ضرورت تھی۔ قائداعظم کا اس وقت کانگرس اور مسلم لیگ دونوں تنظیموں میں طوطی بولتا تھا۔ جب لکھنؤ پیکٹ ہوا، اس وقت گاندھی کی شخصیت اتنی قابلِ لحاظ نہ تھی جتنی بعد میں بن گئی۔ ۱۹۱۶ء میں گاندھی جی نے لکھنؤ سیشن کے ضمن میں کوئی سرگرمی نہ دکھائی اور نہ اس کی کسی کارروائی میں کوئی قابلِ ذکر حصّہ لیا۔ مجلس موضوعات (SUBJETS COMMITTEE) میں بھی جنوبی افریقہ کے موضوع پر ان سے فرمائش کر کے کچھ کہلوایا گیا[۲۸]۔ ۱۹۱۷ء میں تو ابھی وہ انگریزی فوج کے لیے رنگروٹ بھرتی کر رہے تھے۔ افریقہ میں بھی انگریزی فوج کے ساتھ منسلک رہے تھے[۲۹]۔ انہی خدمات کے باعث انھیں حکومتِ برطانیہ کی طرف سے تمغۂ "قیصرِ ہند" ملا تھا[۳۰]۔ مسٹر یجنیک کے بقول ان کو "ہوم رول لیگ" والوں سے کوئی دلی ہمدردی نہ تھا، وہ خواہاں تھے کہ کوئی "ہوم رول" کے بارے میں کانا پھوسی بھی نہ کرے، بس برطانیہ کے لیے غیر مشروط قربانی دی جائے۔ مگر بعد میں گاندھی کو اچانک شہرت اور مقبولیت حاصل ہو گئی۔ اس کا باعث حادثہ جلیانوالہ باغ اور خلافت کی تحریک تھا۔ گاندھی نے ان دونوں معاملات کو جوڑ کر مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور دیگر مسلم قائدین کی مدد سے ہندو مسلم اتحاد کا ایک پُرجوش منظر پیدا کر دیا۔ جو ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۲۳ء تک جلوہ گر رہا۔ اس عرصے میں مسلم لیگ قطعاً معطل ہو کر رہ گئی اور یہی مہاتما گاندھی کا اصل مقصد بھی تھا۔ اسی عرصے میں گاندھی نے ہندوؤں کی سیاست میں گائے کو داخل کیا اور سیاسی تحریک کو مذہبی رنگ دے کر تعصب کو ہوا دی[۳۱]۔ خلافت کا مسئلہ تو خالص دینی مسئلہ تھا ہی، گاندھی ہندوؤں کے لیے اس تحریک کو محض سیاسی کیوں رہنے دیتے۔ چنانچہ خلافت اور جلیانوالہ کی پیدا کردہ گرماگرمی نے ایک جانب مسلمانوں کے بحیثیت مسلمان جذبات اُبھارے اور دوسری جانب ہندوؤں کے ہندوؤں کی حیثیت سے۔ اور یہ سب کچھ ظاہری اتحاد کے پردے میں ہوتا رہا۔

---

[۲۸] مہاتما گاندھی ایز آئی نو ہم، ص ۶۲، ۶۳ ۔ آئی۔ کے یجنیک، ۱۹۴۳ء

[۲۹] گاندھی اینڈ ماڈرن انڈیا، ص ۴۶ ۔ پنڈرل مون ۱۹۶۹ [۳۰] ایضاً، ص ۷۸

[۳۱] یجنیک، ص ۱۱۶ ۔ پنڈرل مون، ص ۲۸۹ ۔ ایف کے درانی، ص ۸۳

نتیجہ یہ کہ اُدھر یہ تحریکیں اختتام کو پہنچیں اور اِدھر ہندو مسلم فسادات کے خوں ریز سلسلے شروع ہو گئے۔[۳۲]
لکھنؤ پیکٹ کی فضائے مفاہمت کو برباد کرنے کی ذمہ داری قائداعظمؒ نے مسٹر گاندھی ہی کے کاندھوں پر ڈالی ہے۔ اس ضمن میں قائداعظم کا وہ خطبہ بہت اہم ہے جو انھوں نے مسلم لیگ کے اجلاس دہلی اپریل ۱۹۴۳ میں ارشاد فرمایا تھا ـــــ اس خطبے میں انھوں نے صاف کہا کہ گاندھی ہندو مہاسبھا کے زیراثر رہے ہیں اور انھوں نے ہندو مسلم مفاہمت کی روح کو کچل دیا۔[۳۳]

ہندو مہاسبھا کی بنیاد تو پہلے رکھی جا چکی تھی مگر اسے کوئی زیادہ ترقی نہ دی گئی تھی اسے خوابیدہ رکھا گیا تھا۔ ۱۹۲۴ میں اس کا بجوش وخروش احیا عمل میں آیا اور لکھنؤ پیکٹ کے خلاف ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ مہاسبھائی پنجاب میں سب سے زیادہ پُرجوش تھے جن کے سربراہ لالا لاجپت رائے اور مدن موہن مالویہ تھے[۳۴] اور ایک باعث اس کا یہ ہوا میاں سر فضل حسین نے لکھنؤ پیکٹ کے مطابق پنجاب میں مسلمانوں کو ۴۰ فی صد حصہ ہمہ جہتی ملازمتوں میں دینا شروع کر دیا تھا۔[۳۵] ہندو یہ کیونکر برداشت کرتے کہ مسلمانوں کو ان کا حق ملے ۔ ہندوؤں کی برپا کردہ شورش کے توڑ پر مسلم لیگ نے بھی ۱۹۲۴ کے سالانہ اجلاس میں لکھنؤ پیکٹ کے اس حصے کی ترمیم پر زور دیا جو بنگال اور پنجاب میں مسلم نمائندگی کے بارے میں تھا۔ جہاں تک جداگانہ انتخاب کا تعلق ہے اس شق کو برقرار اور باصرار برقرار رکھا گیا۔ مگر قائداعظم بہرحال باہمی گفت وشنید اور رضامندی سے ہر معاملہ طے کرنا چاہتے تھے

حق یہ ہے کہ قائداعظم نے مسلم لیگ اور کانگرس دونوں جماعتوں میں اپنے اعتبار سے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا اور دسمبر ۱۹۱۶ء میں مسلمانوں کا جُداگانہ حق انتخاب منوالیا تھا اور ساتھ ہی گویا یہ بھی منوالیا تھا کہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ ہے اور کانگرس فقط ہندوؤں کی نمائندہ ہے[۳۶] پہلی بات نے دو قومی نظریہ تسلیم کیا اور دوسری بات نے مسلم لیگ کو واحد نمائندہ جماعت ہونے کی حیثیت

---

۳۲ ہجنیک، ص ۱۱۷
۳۳ ایف کے درّانی، ص ۸۳
۳۴ فاؤنڈیشنز آف پاکستان، ص ۴۱۰
۳۵ ایس ایم اکرام، ص ۲۱۷
۳۶ ایف کے درّانی، ص ۶۴

سے مسلمانوں کے لیے سیاسی جنگ لڑنے کا حق دے دیا۔ سادھو سروپ سنگھ لکھتے ہیں کہ ۱۹۱۶ کا پیکٹ واضح ثبوت ہے اس بات کا کہ کانگرس انڈین نیشنل کانگرس نہیں اس لیے کہ ایک ہی برادری کے لوگوں کے مابین معاہدات کے کیا مواقع ہیں۔ معاہدات کا وجود ثابت کرتا ہے کہ پارٹیاں موجود ہیں اور معاہدات تصدیق ہیں اس امر کی کہ اختلافات ہیں جن کو دُور کیا جا رہا ہے یا ملاپ اور مصالحت کی کوشش کی جا رہی ہے۔ معاہدات کا وجود تقسیم کا ثبوت ہے نہ کہ وحدت کا۔[۳۷]

اسی طرح پروفیسر بل راج مدھوک اپنی انعام یافتہ کتاب میں لکھتے ہیں:

"کانگرس نے یہ پیکٹ کر کے تسلیم کر لیا کہ مسلمان باقی ہندوستانیوں سے کوئی مختلف قوم ہیں اور یوں بالواسطہ اس نے دو قومی نظریے کے لیے زمین ہموار کر دی، مزید یہ کہ اس نے فرقہ وارانہ طریق انتخاب کو تسلیم کر کے ضمناً خلافِ قوم (متحدہ قومیت کے تصور کے خلاف) لائحہ عمل کی منظوری دے دی، اور اس طرح نے شک و شبہ سے بالا قومی مقام بلند سے نیچے اترنا شروع کر دیا۔"[۳۸]

بہر حال میثاق لکھنؤ واحد ایسا واقعہ ہے جو سیاسی سطح پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین باہمی رضامندی سے تقریباً بخیر و خوبی طے پایا۔ قائداعظم نے تو سمجھا تھا کہ اس طرح کی فضا مصالحت برقرار رہے گی اور ہندو اور مسلمان دونوں قومیں ایک دوسرے کے حقوق کا احترام کرتی رہیں گی مگر ایسا نہ ہو سکا۔ ہندو ہندو ہی رہا اور مسلمان مسلمان ہی رہا اور دونوں کے مابین جو بنیادی اور وسیع خلیج بہر اعتبار حائل تھی وقت کے ساتھ ساتھ وسیع تر ہوتی چلی گئی اور پھر ساتھ ساتھ یہ میثاق مسلمانوں کے لیے دوست دست گیر بنتا چلا گیا اور ہندو کے لیے طوقِ گلوگیر کی صورت اختیار کرتا چلا گیا۔ ہندو کانگرس اس میثاق کے بعد مسلمانوں کی نمائندہ نہ رہی۔ پہلے بھی نہ تھی مگر اس میثاق کے بعد اس کا دعویٰ قطعاً بے دلیل ہو کر رہ گیا۔ مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کو بعد میں بھی چیلنج تو کیا جاتا رہا مگر یہ میثاق اس چیلنج کا مضحکہ اڑا دیتا رہا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ میثاق قائداعظم کے تدبر کا ایک ادنیٰ مظہر تھا۔

---

[۳۷] دی سکھس ڈیمانڈ دیئر ہوم لینڈ، ص ۲۶ — سادھو سروپ سنگھ۔

[۳۸] ہندوستان اون دی کراس روڈز، ص ۲۷ — پروفیسر بل راج مدھوک۔